بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

۱۹۸۶ء پُر اضطراب سال تھا، خصوصاً جاتے جاتے وہ ہمیں ایسے چرکے لگا گیا ہے کہ زخموں کا اندمال ہوتے ہوتے دیر لگے گی۔ خدا کرے کہ ۱۹۸۷ء کی آمد باعثِ خیر و برکت ہو اور پچھلی خرابیٔ احوال کی درستی کی مؤثر صورتیں جلد پیدا ہوں اور خیر و خوبی کے نئے امکانات کے دروازے کھلیں، دین کی سربلندی ہو، شریعت کو غلبہ حاصل ہو، پاکستان کو سالمیت و استحکام ملے اور اسلام اور پاکستان اور پاکستان کے باشندوں کے معاندین کو اللہ تعالیٰ خائب و خاسر کرے، اور ہر طرح کے مصائب و خطرات کے طوفانوں سے ہمیں تحفظ دلائے۔ سلطنتِ حیات و کائنات کے فرماں روا سے ہماری التماس یہ بھی ہے کہ وہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کام کرنے والوں کو نورِ ایمان، شعورِ دعوت، رابطۂ عام، خدمتِ انسانیت کی سعادتوں سے نوازے اور ان کی تائید و نصرت فرمائے۔ پورے عالمِ اسلام کے لیے ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ اقامتِ دین کی تحریک کو قوت عطا کرے، مظلوم مسلمانوں کو مظلومی سے نکالے اور ظلم و کفر و طاغوت کے خلاف جہاد کرنے والے مسلمانوں کو ——— افغانستان سے فلسطین تک اور اریٹریا سے مورو لینڈ تک ——— فتح مند کرے۔ آمین۔

کیا ہی دردناک لمحۂ دعا اور مرحلۂ سعیٔ فلاح و بقا ہے کہ ایک طرف ہمارا معاشرہ اندرونی طور پر بدعنوانیوں اور بہیمانہ حرکات کے نشے میں گم ہے، دوسری طرف باہر سے آمدہ تخریب کار اور پاکستان دشمن

اور اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ اور کمانڈوز ہماری کتابِ وحدت کا شیرازہ درہم برہم کرنے اور اس کے اوراق کو بکھیرنے کے درپے ہیں، اور دوسری طرف شمالی سرحد اور جنوبی سرحد پر عسکری جارحیت کا بھیانک خطرہ منڈلا رہا ہے۔

اندر کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اور تعصبات کو بھڑکا کر کراچی جیسے شہرِ امن کو دیکھتے دیکھتے بیرونی اور اندرونی شر پسندوں نے مل کر خون اور آگ اور موت کے حوالے کر دیا۔

ہم ہر مصیبت زدہ فرد، ہر خاندان، ہر محلے، ہر برادری، پورے شہر کراچی، صوبہ سندھ اور سارے پاکستان کے سامنے اپنے جراحت زدہ دل سے ٹپکتے لہو کی بوندیں پیش کرتے ہیں۔ تمام خاندان ہمارے خاندان ہیں، تمام برادریاں اور تمام محلے اور تمام شہر ہمارے جسمِ ملت کے قیمتی اجزا ہیں۔

آج جب کہ تباہی کا طوفان کچھ تھما ہے، ساری قوم کو محسوس کرنا چاہیے کہ نقصان جان و مال ہی کا نہیں ہوا، بلکہ بڑا نقصان ہمارے باہمی جذبہ ہائے اخوت و محبت کا نقصان ہے، وحدت و سالمیتِ پاکستان کا نقصان ہے اور اُن اسلامی رجحانات کا نقصان ہے جو قرار دادِ مقاصد کی منظوری سے لے کر موجودہ شریعت بل کی منظوری تک مسلسل مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ شدید جذباتیت نے فضا پر تسلط پا کر تحمل و تدبر کی قوتوں کو ماؤف کر دیا، جن کے ذریعے بدترین مصائب کا مقابلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔

ہمیں بڑا افسوس اس بات پر بھی ہے کہ جب یہ بات ہفتوں پہلے سے معلوم و مشہور تھی کہ روس اور بھارت اور اسرائیل سے تخریب کاری کے ماہر کمانڈوز اور "خاد" اور "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹ بڑی تعداد میں ملک کے اندر داخل ہو رہے ہیں تو کیوں نہ ایسا ہوا کہ ملک کے اندر داخل ہونے والے ہر شخص کے نقل و حرکت کی پوری نگرانی کی جاتی۔ مشتبہ لوگوں کو پوری طرح زیرِ نظر رکھا جاتا، اور جہاں کسی غلط شخص سے کوئی ٹیڑھی حرکت سرزد ہوتی، اسے فوراً گرفت میں لے کر سازش کی مزید کڑیوں کو بھی معلوم کر لیا جاتا۔

یہاں "ہتھوڑا گروپ" کا دور دورہ رہا، مختلف جگہوں پر بم پھٹتے رہے، ڈاکوؤں کی سرگرمیاں غیر معمولی حد تک پُر زور ہو گئیں۔ اِن سارے حالات میں حکومت تدبر سے کام لے کر اپنے فرائض کما حقہ

ادا نہ کر سکی۔

لیکن ایک حکومت ہی کی کوتاہ کاریوں کا معاملہ ہوتا تو بھی مسئلے کا حل آسان ہوتا۔ سیاسی لیڈروں نے بھی تو معاشرے کو ظہورِ خطرات کے مختلف پیرایوں سے آگاہ نہ کیا۔ اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے طوفان آنے سے پہلے محلے محلے، گلی گلی تنظیم بندی نہ کی۔ واعظانِ مسجد نے بھی تو اپنی اپنی مسجدوں کے علاقوں میں خطرات سے انتباہ کے لیے شریف اور امن پسند شہریوں پر توجہ نہ دی۔ پولیس بھی اپنا فرض نہ ادا کر سکی، بیوروکریسی بھی کوتاہ رہی اور عام لوگ بھی اپنے اپنے روزمرہ مسائل اور مشاغل ہی میں منہمک رہے۔ تیس چالیس سال کی مہلتِ کار میں جمہوری اور اسلامی ساری قوتوں سے یہ کام نہ ہو سکا کہ وہ ہر بستی میں امن و سلامتی کے ایسے نقیبوں کے مضبوط گروپ قائم کر سکتے، جو تخریبی عصبیتوں اور گروہی نفرتوں کا بڑے سے بڑا طوفان اُٹھنے پر استقامت سے توحید اور شرفِ انسانیت کے جذبوں سے سرشار ہو کر تخریبی قوتوں کے برپا کردہ فساد و عناد کی روک تھام کرتے۔

وقت پر خطرے کی پیش بندی نہ ہو سکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ گویا سرکنڈوں یا بانسوں کے جنگل میں آگ لگ گئی۔ جذباتی ہیجانات کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو فوری طور پر خدا پرستی یا حبِ وطن، یا انسانی بہبود کا سبق کون دے سکتا تھا؟ لسانی اور علاقائی اور نسلی تعصبات کے طوفان کی اُمڈتی لہروں کو کمر سے پکڑ کر نہیں روکا جا سکتا۔ تعمیر و اصلاح کا کام اسی وقت ممکن ہے جب کہ تخریبیوں کے آسیب کا اثر ختم ہو جائے۔ تعصبات کے طوفان تھم جائیں۔ انتقام در انتقام کے بہیمانہ جذبات کا زور ٹوٹ جائے۔ اور وہ گم شدہ انسان نمودار ہو جائے جو بھلائی کا پیغام سنتا ہے اور آمادۂ اصلاح ہو جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے وہ وقت نمودار ہو رہا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ خدا کے مخلص بندے اور انسانوں کے سچے محب کچھ وقت لگا کر اور گھر گھر تک سلامتی کا پیغام پہنچا کر از سرِ نو سچائی اور نیکی اور محبت و اخوت کی پنیری لگائیں۔

اس دوران میں خاصی آوازیں بلند ہوئیں کہ چونکہ خرابیٔ احوال کی آخری ذمہ داری حکومت ہی پر عائد ہوتی ہے، لہٰذا وہ مستعفی ہو جائے اور وہ اپنی نااہلیت کی بنا پر قیامِ امن کے لیے برآمدگیٔ اسلحہ و منشیات کی ساری کارروائی بند کر دے۔ اور جواباً کابینہ ٹوٹ گئی، اب نئی مجلس ترتیب دی جا رہی ہے۔

حکومت اور اس کی مشینری کی پچھلی غلط کاریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے عوام کے اعتماد میں جو تزلزل آیا ہے اور بددلی و مایوسی کے شدید رجحانات نے جس انتقامی جذبے کی شکل اختیار کر لی ہے، اُن سے ناکام سیاست باز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور ایم آر ڈی اور اسی طرح کے سیاسی عناصر اور سیاسی قائدین کا عوام کے مشتعل جذبات کو اچک لینا اور ان جذبات کے جھنڈے بنا کر اُٹھا لینا اُس تدبر و تحمل کے خلاف ہے جو سیاسی لیڈروں اور سیاسی تنظیموں سے متوقع ہوتا ہے۔ موجودہ حکومت میں ہزار خرابیاں ہیں اور اس سے پہلے بھی جو حکومتیں ہمارے سروں پر مسلط رہی ہیں اُن میں بھی بہت خرابیاں تھیں۔ ان میں سے جن کو تبدیل نہیں کیا جا سکا وہ بھی سامنے ہیں اور جن کو تبدیل کیا گیا اُن کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ اور نئی آنے والی حکومتیں بھی ویسی ہی ہوں گی۔

ایوان سے باہر رہ جانے والے سیاست دانوں کا مفہوم حکومت بدلنے سے یہ ہے کہ موجودہ ایوان ہی یکسر توڑ دیے جائیں اور نئے انتخابات منعقد ہوں۔ فرض کیجیے کہ ایوان توڑ دیے گئے۔ کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ بعد ازاں انتخابات ضرور منعقد ہوں گے یا ہو سکیں گے؟ ایک بڑا امکان یہ ہے کہ باہر سے کوئی طاقت ایسی حرکت کر بیٹھے ...... کہ ہمیں انتخابات کے ذریعے حکومت بنانے کا موقع ہی نہ ملے۔ دوسرا بڑا امکان یہ ہے کہ ایک بار پھر مارشل لا نئے چہرے کے ساتھ نمودار ہو جائے۔ یہ ایسے ہی ہو گا جیسے ایوب خاں کا دورِ آمریت ختم ہوا تو یحییٰ خاں کا مارشل لا شروع ہو گیا۔ اور یہی صورت پاکستان توڑنے والوں کو مطلوب تھی۔ تیسرا بڑا امکان یہ ہے کہ موجودہ ایوانوں کو توڑ دینے کے ساتھ ہی تخریب پسند تشنگانِ اقتدار جن کی پشت پناہی باہر سے بھی ہو رہی ہے، یہ طوفان اُٹھا دیں کہ قومی حکومت ہونی چاہیے اور قومی حکومت کی زیادہ سے زیادہ کرسیاں ان کے قبضے میں چلی جائیں یا اُن کے ہم سفروں یا پیروکاروں کے قبضے میں۔ اور پھر حکومت اُن کے پاس جتنے عرصے کے لیے بھی گروی رہے، اس عرصے میں وہ حالات کا مزید ستیاناس کر دیں۔

چوتھا بڑا امکان یہ ہے کہ فرض کیجیے کہ انتخابات بھی ہو جاتے ہیں، نئی حکومت بھی قائم ہو جاتی ہے، اس کے باوجود بھی معاشرے کو بیوروکریسی اور انتظامیہ کے بگاڑ سے نہ بچایا جا سکے گا، جس کے احکام و اعمال بدعنوانیوں، افتراقات اور تضادات کا بہت بڑا سبب ہیں، نیز اس معاشرے کا کیا

علاج جس کے ہر شعبے میں خیانت، بدنظمی، جہالت اور جبریت کا اودھم مچ رہا ہے۔ میرا ذاتی نقطہ نظر یہ ہے کہ اس حال میں اگر کسی متقی دوران کو بھی وزیراعظم بنا دیا جائے اور علماء اور صوفیاء کی ایک ٹیم بھی ان کے ساتھ انتخابات میں آ جائے تو بھی حالات کو پوری طرح سدھارنا ممکن نہیں۔ یہ ممکن ہے تو صرف ایک ایسے انقلاب کے بعد ممکن ہے جو موجودہ قانونِ عملداری اور نظامِ حکومت سیاسی اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ معیشت، اور غلط الفکر و کج عمل افسروں کی گرفت سے آٹھ کروڑ انسانوں کو نکال سکے۔

بہرحال ایسے نازک مرحلے پر تازہ انتخابات کا انعقاد اس بنا پر سخت خطرناک ہے کہ باہر سے ایک عالمی قوت اور دو بڑے ملکوں نے اپنے تخریب کاروں کی بہت بڑی تعداد کو معاشرے میں اتار دیا ہے جنہوں نے ہمارے ہاں کے ہر غلط الفکر شخص، ہر علیحدگی پسند عنصر اور ہر مریض تشنگیٔ اقتدار پر جادو کر رکھا ہے۔ ان کی اسکیم ہی یہی ہے کہ پہلے امن کو تباہ کیا جائے، ملکی وحدت اور دینی محبت کو تباہ کیا جائے، پھر آگ اور خون کے طوفان اٹھا کر ہلاکت و بربادی کے ایسے بہیمانہ مناظر مہیا کیے جائیں کہ لوگ شدید جذباتی ہیجانات کی پے در پے اٹھنے والی لہروں کا مقابلہ کرتے کرتے صبر و تحمل اور غور و تدبر کی صلاحیت کو کھو بیٹھیں۔ اس کے بعد جذباتی فضا میں تبدیلیٔ حکومت کا نعرہ بلند کیا جائے اور اس میں اگر کامیابی ہو جائے تو پھر وہ اگلی تدابیر عمل میں لائی جائیں جن سے پاکستان کے وجود یا اس کی سالمیت کو دھچکا لگانا آسان ہو جائے۔

آپ ذرا اس ایک سوال کا جواب ہی زیرِ غور لائیے کہ اگر موجودہ پورا ایوان رخصت ہو جائے تو آپ ذرا کاغذ قلم لے کر وہ فہرست لکھیے کہ بعد ازاں آپ کی فہرست کے مطابق کون سے بہترین اشخاص کا سامنے آنا ممکن ہے جن کے ہاتھ میں اختیارات دے کر ہم بے فکر ہو سکیں کہ اب ہماری حکومت اور ہمارا نظامِ ملکی باصلاحیت ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ آپ یونہی اپنے ملک کے اچھے اچھے لوگوں کے نام نہ لکھتے جائیں بلکہ موجودہ نقشۂ احوال میں جن کا ابھر آنا ممکن ہو، صرف اُن کو سامنے رکھیں، اور یہ بھی بتائیں کہ موجودہ قانونِ عملداری اور قواعدِ دفتری اور ضوابطِ ملازمت کے ہوتے ہوئے وہ نیک لوگ کیسے کج خصلت افسروں میں سے کسی کو اس کی کرسی سے ہلا سکیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری مجموعی حالت اتنی خراب ہو چکی ہے کہ جس حکومت کو بھی آپ سامنے لائیں گے

وہی باعثِ مصیبت بنے گی اور پھر آپ اس کے خلاف زور لگائیں گے کہ یہ حکومت بڑی خراب ہے۔ اس قسم کے اندھے تجربوں میں سے قوم کو بار بار گذارنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عوام جلسے جلوسوں میں تو آجاتے ہیں، مگر حکومت بدلنے کی کسی تحریک کو لے کر تادیر صبر و استقامت کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ ان کو روایتی "بناش اول" اور "بناش دوم" کے تجربے نے کس کر رکھا ہے۔

پھر یہ حقیقت بھی ہر صاحب شعور اور حق پرست کو سمجھ لینی چاہیے کہ بگاڑ صرف اوپر ہی اوپر تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا درمیانہ طبقہ، نچلا درمیانہ طبقہ، غریب طبقہ سب میں زہر سرایت کر چکا ہے اور ہمارے عوام بھی فرشتے نہیں ہیں۔ جسے اصلاح مطلوب ہو وہ اس حقیقت کو مان کر قدم اٹھائے۔

موجودہ حکومت کو بدلنا کیا مشکل ہے، لیکن اصل کام کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کے عقائد اور نظریات اور مقاصد اور میلانات اور اخلاق کو بدلا جائے۔ مصیبت زدوں کی خدمت کے لیے جہاں ضرورت پڑے، ڈیرے ڈال دیے جائیں۔ اور غلط کار عناصر اور تباہ کن کارروائیوں کے سرچشموں کا سراغ نکالنے کے لیے خاص کوشش و کاوش کی جائے۔ اس طرح تعمیری و اصلاحی کام جس بھی جماعت یا لیڈر نے کر رکھے تھے، اسے چاہیے کہ ان کے ناکافی ہو جانے کے بعد کمی کو پورا کرنے کے لیے دس گنا زیادہ محنت کرے۔ اور جس نے پہلے ایسا کوئی کام کیا ہی نہیں، وہ اب اقدام کرے۔

انتخابات بھی ہوتے رہیں گے اور حکومتیں بھی بدلتی رہیں گی، اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ خود بدلیں، اپنے کارکنوں کو نیا کردار دیں۔ اور عوام کو عصبیتوں کے چکر سے نکال کر اسلام یا انسانیت کا ایسا مضبوط شعور دلائیں کہ ہزار تخریب کار گلی گلی میں پھیل جانے کے باوجود ان کو جذباتی ہیروئن کے نشے میں بہکا کر اپنی ہی تباہی کا باعث نہ بنا سکیں۔

آج حکومت کی تبدیلی تو یہ اثر ڈالے گی کہ نئے نئے اقتدار طلب اور ان کے حامی اُدھر لپکیں اور ایک دوسرے کے حریف بن کر اپنی قوتوں کو گرد و غبار میں بدلتے رہیں۔ پھر کون ہو گا جو مہاجرین یا پٹھانوں یا دوسرے مصیبت زدہ لوگوں میں کوئی ٹھوس دعوتی و خدمتی کام کر سکے۔ پھر تو سارا کام ان کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہو گا اور اگر ووٹوں کا چکر واقعی چلا تو بعید نہیں کہ جگہ جگہ نسلی اور علاقائی اور لسانی بنیادوں پر فسادات کے صد ہا طوفان اٹھ کھڑے ہوں۔ پھر ہم ایسے بحران سے دوچار ہوں جن سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ رہے اور اندر اور باہر کے دشمن ہماری

گردنوں پر غلامی کا جوا رکھ دیں۔
یوں، پورا نقشۂ امکانات سامنے رکھ کر معاملات کو سوچیے۔

---

(۲)

"جو لوگ تحریکِ پاکستان میں علامہ اقبال کے خلاف سیاسی جنگ ہار گئے تھے، وہ قیامِ پاکستان کے بعد تعمیرِ پاکستان سے متعلق علامہ کے افکار کو دبانے اور انہیں شکست سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔"

یہ الفاظ نہ کسی سیاسی اسٹیج سے نشر ہوئے اور نہ کسی اصطلاحی "صحافی" کا فنی کارنامہ ہیں، بلکہ ارشادِ عالیہ ہے ہمارے نہایت ہی محترم دوست اور علمی فضیلت رکھنے والے ایک صاحبِ قلم کا، جنہیں ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کہا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو: نوائے وقت ۱۸-۱۹ نومبر ۱۹۸۶ء) مضمون لکھا گیا ہے اجتہاد کے مسئلے پر اور اصل مبحث کے عقدے وا کرنے کا بھاری قرض تو ناخنِ تفکر پر ہے ہی ــــ مثلاً علامہ کا مجتہدِ مطلق ہونا وغیرہ! ــــ لیکن مسئلہ اجتہاد کے پیڑ سے بعض عجیب عجیب کونپلیں پھوٹی ہیں ــ ایک وہ ہے جسے اوپر پیش کیا گیا ہے۔

ابو عمار زاہد الراشدی نے اس پر گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ قانون سازی اور اجتہاد کے حق کی علمی بحث کا قیامِ پاکستان کی مخالفت سے کیا تعلق ہے، کیونکہ یہ ایک فیشن بن گیا ہے کہ جب علماء کے خلاف اور کوئی بات کہنے کے لیے نہ رہ جائے تو قیامِ پاکستان کی مخالفت کے طعنے کی آڑ میں بھڑاس نکال لی جائے۔ لیکن اس سے قطع نظر ہم ڈاکٹر گورایہ صاحب سے یہ ضرور پوچھنا چاہیں گے کہ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، پیر صاحب مانکی شریف، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا سید سلیمان ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے ہزاروں رفقاء کا وہ کس زمرہ میں شمار کریں گے جنہوں نے نہ صرف تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا، بلکہ تحریک کی

نہایت سی کامیابیوں میں فیصلہ کن کردار ادا کیا، اور اگر بات اسی رُخ پر کرنا ضروری ہے تو ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قرارداد پاکستان اور علماء کے ۲۲ نکات کی صورت میں تعمیرِ پاکستان کی فکری بنیادیں متعین کرنے والے یہی علماء تھے جنہوں نے قیام کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا اور علامہ اقبال کی تحریک کو تکمیل تک پہنچایا، اس لیے علامہ محمد اقبال کے افکار کی ترجمانی میں وہ دوسروں سے زیادہ مستند حیثیت رکھتے ہیں۔"

(نوائے وقت ۹ دسمبر ۱۹۸۶ء)

ہم ایک دوسرے پہلو سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

علم کی خود اپنی ایک دُنیا اور اپنی ایک سلطنت ہوتی ہے۔ اس دُنیا کے نظام کا درست رہنا اور اس کی سلطنت کی صحیح کارفرمائی صرف اسی صورت میں قابلِ تصور ہے کہ تعصبات اس میں راہ نہ پائیں۔ یہاں تو آپ اپنی دلیل لائیے اور دوسرے کی دلیل طلب کر کے اس پر غور کیجیے۔ دوسرا جس چیز سے متاثر ہو وہ اسے قبول کر لے اور آپ جس چیز سے متاثر ہوں اُسے آپ اخذ کر لیں۔

لیکن دلائل سے زیادہ اہم اگر یہ سوالات ہو جائیں کہ تمہارا سیاسی مسلک کیا ہے؟ یا تم ادب میں کن اقدار کو اہمیت دیتے ہو یا تمہارا تعلق کس نسل سے اور کس علاقے سے ہے؟ تمہاری مادری زبان کیا ہے؟ وغیرہ — تو پھر علم کی سلطنت درہم برہم ہو جاتی ہے۔

علم کی سلطنت میں اہمیت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو محنت کریں اور کام کریں۔ اقبال کے افکار پر جو لوگ بھی زیادہ اچھی طرح کاوش کر لیں گے، بات انہیں کی وزن پائے گی۔ وہ کچھ کہیں گے تو سُنا جائے گا۔ اور وہ کچھ لکھیں گے تو پڑھا جائے گا۔ یہاں کسی کا حق شفعہ نہیں چلتا۔

حیرت ہے کہ ڈاکٹر ٹگورایہ صاحب نے کس طرح یہ عجیب سا نقطہ اُٹھا دیا۔ براہ کرم اس مصرعہ پر نظر کریں

"مُلکِ معنی کس حد او را نہ بست" (اقبال)

مُلکِ معنی یا سلطنتِ علم کا حال بھی ہمارے ہاں ایسا ابتر ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ بیماریِ تعصب کسی ایک صورت میں ہو یا کسی دوسری وجہ سے، وہ اس درجہ پھیلی ہے کہ ہر گروہ نے بھی اور ہر آدمی نے بھی اپنے خیالات اور نظریات کا کھیت الگ کر رکھا ہے اور اس پر پکی باڑ لگا رکھی ہے۔ باہر کی کوئی چیز اندر نہیں آسکتی۔ علمی بحثوں کی سطح ہو (جس کا دائرہ ہمارے ہاں بڑا محدود ہے) یا تقریری اور صحافیانہ مرتبۂ اظہار،

مشکل ہی سے کوئی مثال ایسی ملتی ہے کہ کسی شخص نے اپنے ارشادات پر کوئی تنقید پڑھ کر کہا ہو کہ ہاں اب مجھے اپنے طرزِ فکر کی ایک خامی کا احساس ہوا ہے یا مجھے ایک نئی حقیقت سے آگاہی ہوئی ہے ___ کوئی فاضلِ دوراں ہو یا طفلِ مکتب ___ میدان میں آئیں گے تو دونوں کا زعم یہی ہوگا کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ خصوصیت کے ساتھ مناظرہ باز واعظوں کے طرز پر اب اخبارات نے یہ پختہ انداز اختیار کر لیا ہے کہ ہر ایک اپنے نظریات و مقاصد کے مطابق چیزوں کو اچھالتا ہے۔ اپنے پسندیدہ گروہوں کو کھل کر جگہ دیتا ہے اور اپنے کالم نویسوں کا جھنڈا خوب اونچا کرتا ہے اور ان کا کوئی جواب دے تو اوّل تو اُسے شائع نہ کیا جائے گا، کیا جائے گا تو دیر کی جائے گی، پھر جب جگہ دی بھی جائے گی ___ تو کتر بیونت کا خود ایجاد کردہ لامحدود حق استعمال کیا جائے گا۔ بعض اوقات بے تکی سرخیوں سے مضمون کا پہلا اثر قاری کے لیے بدل دیا جائے گا۔ بعض اوقات اصل بات مسخ کر دی جائے گی۔ خبر کے چہرے کا مُثلہ کر دیا جائے گا اور بیان کا حلیہ بدل دیا جائے گا۔ زیادہ اہمیت کی چیز کو غیر اہم اور غیر اہم بات کو اہم بنا کر پیش کرنا، لوگوں کے ذہنوں کو کسی بھی تجویز کردہ رُخ پر ڈال دینا، عوام کے ادنیٰ جذبات کو اُکسا کر فائدہ اُٹھانا یہ ایسی باتیں ہیں جو اب لازمۂ صحافت بن گئی ہیں اور صحافت کا اثر روزانہ کی خوراکیں دینے کی وجہ سے نئی نسلوں پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔

لبرل ازم کے نعرے لگانے والے تک اتنے لبرل نہیں ہیں کہ وہ اپنی کسی رائے کو دوسروں کے بہتر دلائل کے زیرِ اثر چھوڑ دیں یا دوسروں کے کسی خیال کو کھلے دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے قبول کریں۔ "جمہوریت" کے بے شمار دیوانے مستانے ملیں گے، مگر گفتگو اور بحث و استدلال کے ذریعے ایسے انداز پر تبادلۂ خیال کرنے سے عاری ہوں گے کہ دو طرفہ اچھے خیالات اور اچھی آرا کا لین دین ہو سکے۔ جس معاشرے میں علمی اور فکری دائرے میں ایسا تعصب پایا جاتا ہو، اس میں اگر برادریوں اور علاقوں اور فرقوں کے نام پر تصادم ہونے ہوں اور لوگ بات بات پر تشدد کے ہتھیار لے کے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوں تو تعجب کیوں؟

پہلے علمی و فکری دائرے میں ضروری رواداری سیکھیے، پھر معاشرے میں وحدت بھی بڑھے گی اور جمہوریت کا عمل بھی صحیح طریق سے جاری ہو سکے گا۔

ایک شخص اقبال پہ بات چھیڑے تو اُسے روک کر پوچھا جائے کہ مشہور ہم انکات کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ بائبلی پیشوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ یا کیا تمہارے آباواجداد میں سے کسی نے

انقلاب ۱۸۵۷ء میں کسی انگریز عورت اور اس کے بچوں کو طوفانِ قتل و غارت سے بچایا تھا؟ یا کیا تم نے تقسیم کے وقت ہندوستان میں رہ جانے کا فیصلہ کیا تھا؟ یا تم مولانا آزاد کی تحریریں تو نہیں پڑھتے رہے ہو؟ وغیرہ ـــــ اور پھر ان سوالات پر جب آپ کے حسبِ مراد جواب نہ ملے تو آپ فرمائیں کہ بس آپ کو علم کی سلطنت میں داخلے کا ویزا نہیں مل سکتا۔ اور یہ ویزا نہ ملے تو آپ اسلام کے کسی اصول کی توضیح نہیں کر سکتے، تاریخِ ملت کے کسی باب یا کسی شخصیت کے متعلق رائے نہیں دے سکتے۔ پاکستان کی صلاح و فلاح اور سالمیت و استحکام کو موضوع نہیں بنا سکتے، قائداعظم کے متعلق کوئی تحریر و تقریر نہیں کر سکتے۔ اور علامہ اقبال کے کلام کے بارے میں نہ اپنے تاثرات بتا سکتے ہیں اور نہ اُن کے پیغام کا تعین کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نکلسن اور ڈاکٹر این میری شمل کے لیے مباح ہے کہ وہ اقبال کے متعلق جو چاہیں کہیں۔ مالک رام اور جگن ناتھ آزاد کو چھوٹ ہے کہ وہ اقبالؒ کو فکر و فن کے دونوں پہلوؤں سے جانچیں۔ کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو حق ہے کہ وہ اقبال کے پیکرِ معنی کو توڑتے موڑتے رہیں۔ کیا ایسے تمام لوگ تحریکِ پاکستان کے جانباز تھے؟

کل آپ کہیں گے کہ جو شخص تحریکِ پاکستان کا علم بردار نہیں تھا، وہ سرے سے کسی علمی و ادبی کام کا استحقاق نہیں رکھتا۔ وہ کسی دینی اور قومی اور تہذیبی موضوع پہ رائے نہیں دے سکتا، وہ کوئی تقریر نہیں کر سکتا، کوئی کتاب نہیں شائع کرا سکتا، بلکہ یہ سنئے اور بڑھے تو جو تحریکِ پاکستان کا ساتھ نہ دے سکا ہو اُسے نہ ملکی تحفظ اور دفاع میں کوئی خدمت بجا لانے کی اجازت دی جائے، نہ تعلیم و تعلم کے دائرے میں کوئی کام کرنے دیا جائے۔ نہ سائنس اور زراعت و صنعت کے لیے دماغ اور جسم کے قویٰ کو استعمال کرنے دیا جائے، نہ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کا موقع دیا جائے، بلکہ ہو سکے تو اُسے زندہ رہنے کا حق ہی نہ دیا جائے۔

کسی ایک وقت میں کسی ایک معاملے میں اختلاف ہو جانے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب بعد کے تمام مرحلوں کے لیے ہر طرح کے اتحاد و اتفاق کا دروازہ بند ہو گیا۔ "سیاسی اختلاف" اتنا بڑا جُرم نہیں کہ اسے وجۂ تکفیر بنا کر انسان کی انسانیت اور مسلمان کے ایمان اور کسی صاحبِ دل کی قوتِ فہم و تفہیم سے انکار کر دیا جائے۔ ورنہ اگر تاریخ کے تمام سیاسی اختلافات مختلف گروہوں اور ان کی نسلوں کے خون میں حل شدہ سمجھے جائیں تو آج کوئی فرد بھی، نہ اسلام کے ساتھ، نہ پاکستان کے ساتھ،

نہ علم، نہ ادب اور فلسفہ کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے کا حق دار رہ جاتا ہے۔

سوال یہ ہے ــــ اور اسے ہم پورے زور سے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے تحریکِ پاکستان کی عوامی رَو کا تو ساتھ دیا مگر اس کے نتیجے میں جب اقتدار یا کوئی دوسری امانت اُن کی تحویل میں آئی تو انھوں نے اسے اس طرح استعمال کیا جیسے پاکستان کا کوئی دشمن پاکستان کو تباہ کرنے یا کمزور کرنے کے لیے استعمال کرے ــــ اور جنہوں نے اسلام کے اُصولوں اور قدروں کو پامال کیا اور جنہوں نے اقبال کی خودی، اقبال کے مردِ مومن کے تصور اور اس کی مطلوبہ صفات میں سے ایک ایک کی خلاف ورزی ہی نہیں، غارت گری کی، کیا ایسے لوگ اقبال کو سمجھنے، پرکھنے اور اس کے مدعا کو واضح کرنے اور اس کے مجوزہ نظام کو نافذ العمل کر دکھانے کے لیے مستحق ہو سکتے ہیں؟

پھر ذرا پاکستان بننے کے بعد ان کے بدلتے ہوئے سیاسی رویے، ان کی جنگِ اقتدار، ان کی پارٹیاں بدلنے کے حادثات، اُن کے نت نئے پیرایوں میں جلوہ گر ہونے کے تجربات وغیرہ۔ احوالِ تفصیل سے زیر غور لا کر ارشاد فرمایئے کہ کتنے لوگ ان وباؤں سے بچ نکلے؟ اور جو لوگ سیاستِ دوں نہاد کی ہڑک سے متاثر ہو گئے، کیا اُن کو اب بھی آپ محبِ پاکستان اور محسنِ پاکستان ہی سمجھتے رہیں گے؟ اگر نہیں تو بتایئے کہ پھر اقبال کی تشریح و توضیح اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے والی قوت کون سی رہ جائے گی؟

قابلِ تحقیق مسئلہ تو یہ ہے کہ کیا اقبال کا مقصود صرف سرزمینِ پاکستان کا علیحدہ وجود تھا یا ان کے سامنے اصل نصب العین احیائے اسلام کا تھا؟ آج کل بعض لوگ جو پاکستان کو بہت زیادہ "اپنا" قرار دے رہے ہیں۔ وہ اقبال کو "سیکولر اسلام" کا ایک پیکر بنا کر سینے سے لگائے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایسی آواز کو بند کرنا چاہتے ہیں جو اقبال کو ان کے بنائے ہوئے "سیکولر اسلام" کے پنجرے سے نکالے۔

مگر بے شمار باضمیر لوگ ایسے ہیں جو اقبال کا یہ حالِ زار نہیں دیکھ سکتے۔